مثنویات دبیرؔ، ابواب المصائب اور مصحف فارسی

جناب میرزا کوکب قدر، کلکتہ

مرزا سلامت علی دبیرؔ پر یہ تینوں کتابیں۔ مثنویات دبیرؔ، ابواب المصائب اور مصحف فارسی۔ حسن طباعت کے لیے تو اپنی مثال آپ ہیں ہی نفس مضمون کے لیے بھی عدیم المثال کہی جاسکتی ہیں۔ ان کے مرتب پیشہ کے اعتبار سے طبیب اور اسی لیے ایسے تخلیقی اور تجدیدی ادب کی اشاعت میں عرصے سے کوشاں ہیں جس کے آگے ڈاکٹریٹ کی نمائشی ڈگریاں ہیچ ہیں۔ موصوف کی پرخلوص جستجو، وسیع مطالعہ اور دقیقہ رسی کے اندازے کے لیے ان کتابوں کا سرسری جائزہ ہی کافی ہے۔

نرم لہجہ اور میانہ روی ڈاکٹر تقی عابدی کا مخصوص اسلوب ہے اور اسی لیے وہ اردو مثنویوں کی تحقیق پر نکتہ چینی کرتے ہوئے محقق کی کاوشوں کا ذکر تو ضرور کرتے ہیں لیکن اس پہلو پر توجہ دینا ضروری نہیں جانتے کہ تحقیق کرنے والے نے ایسا کیوں لکھا۔ چنانچہ مثنوی احسن القصص پر ڈاکٹر گیان چند جین کا پورا بیان نقل کیا ہے (ص ۱۷) سوائے اس آخری جملے کے:

''معراج نامہ'' کے بارے میں بھی جملہ معلومات موصوف پروفیسر مسعود حسن رضوی) نے فراہم کیں''

شاید اس لیے کہ وہ مرحوم کا نام زیر بحث لانا نہیں چاہتے جیسا کہ چند سطروں کے بعد بعنوان مختلف اس کا اعتراف بھی کیا ہے:

''یہ مثنویات ادب میں کیوں نمایاں نہ ہوسکیں اس کی وجہ ان مثنویوں کا موضوع نہیں ادیبوں کی سہل انگاریاں ہیں جن کا ہم کسی دوسرے مقام پر ذکر کریں گے۔''

حقیقت یہی ہے کہ مثنویات کا موضوع اور ادیبوں کی سہل پسندی دونوں ہی مثنویات دبیر کے ''عمیق مطالعہ'' سے روکتی رہیں اور ایک کشادہ دل کشادہ ذہن ڈاکٹر جین یا کندن لال کندنؔ تو کیا دبیرؔ کے ہم عقیدہ ہم مسلک ڈاکٹر سید محمد عقیل اور ڈاکٹر سلیمان حسین وہ محقق ہیں جن کو صرف دو مثنویوں کی اسم نویسی سے ہی سروکار تھا۔ ان کا ادبی اور تنقیدی تجزیہ وہ بھاری پتھر تھا جسے چوم کے چھوڑ دینا ہی مناسب نظر آیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ احسن القصص اور معراج نامے کے چار ہزار اشعار کے علاوہ پانچ اور چھوٹی چھوٹی مثنویوں کو جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۶۴ ہے توجہ کے قابل سمجھا اور ہر مثنوی کے تعارف کے طور پر ایک دیباچہ لکھا۔ آٹھویں مثنوی ''مثنوی بے عنوان'' کی دریافت کا سہرا تو ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ کے سر ہے لیکن اس کے مکمل متن (۳۱ صفحے) کی فوٹو کاپی کا شائع کرنا کہ ''دبیر یے'' دبیر کی تحریر سے بھی واقف ہوں اور جو مخطوطات کے پڑھنے میں کچھ مہارت رکھتے ہیں اس کے پڑھنے میں مددگار ہوں اسی صاحب ذوق اور صاحب حیثیت محقق کا کام ہے جو حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کا شیدائی ہے۔

دبیر کا نثری کارنامہ جو ان کی مذکورہ بالا مثنویوں کی طرح اہل قلم کی بے التفاتی کا شکار ہوا کتاب ابواب المصائب ہے (مطبوعہ مطبع یوسفی، دہلی)۔ اسے اردو نثر کے ارتقا، خصوصاً دبستان لکھنو کی خدمات میں ممتاز جگہ ملنا چاہیے تھی لیکن اسے اردو ادب کی تاریخ کا المیہ کہیئے یا کچھ اور، ہم کسی

بھی جامع حیثیات فنکار کی کسی ایک حیثیت کو ترجیح دیتے ہوئے اگر اس کی دوسری خدمات کو بالکل ہی فراموش نہیں کرتے تو ان کا ذکر بھی نہیں جانتے۔ دبیر اگر مرثیہ نگار تھے تو صرف مرثیہ نگار تھے اور وہ بھی مسدس کی ہیئت میں۔ اگر وہی موضوع مثنوی کی شکل میں نظم ہو تو اس کا کوئی حیثیت کے ذکر سے حاصل؟ اور پھر اگر وہی موضوع دبیر کی بالکل ابتدائی شہرت کے زمانے میں ابواب المصائب کی منظر بندی کی صورت میں نمودار ہوا تو اس کے ذکر سے فائدہ؟ بالخصوص ایسی حالت میں جب مصنف نے خود اسے اہمیت نہ دی ہو اور جب یہ مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آیا ایک دوسرے دبستان کی چھاپ لیے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر صفدر حسن، ڈاکٹر آرزو اور ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا ابواب المصائب کی بازیافت کے سلسلے میں کام ڈاکٹر تقی عابدی کے کام سے کچھ کم قابل ستائش نہیں کہ کاشانۂ اردو ادب کے ان جدید معماروں نے اس گم ہو جانے پارے کی اہمیت کو واضح کیا اور ڈاکٹر تقی عابدی نے کھلے دل سے ان جوہر شناسوں کی شناوری کی داد دیتے ہوئے اس کی اشاعت اور تشریح کا وہ کام اپنے ذمہ لیا جو صلہ اور ستائش کی طلب سے بے نیاز ادارے ہی کر سکتے ہیں۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

دبیر کے متفرق فارسی کلام کو یکجا کر کے فاضل مرتب نے اس مجموعے کا "مصحف فارسی" نام رکھا جو سلسلۂ دبیر کی اس گمشدہ کڑی کے لیے ہر طرح موزوں ہے۔ بلا شبہ ایسے نادر و نایاب کلام کا اس آب و تاب سے جا بجا بخط دبیر شائع ہونا اسے حیات نو عطا کرتا ہے۔ "دبیر کا زندگی نامہ" کے عنوان سے دبیر کی زندگی کی خاص خاص باتوں کو ذیلی سرخیوں کے پہلو میں ایسی خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ تمام باتیں خود بخود آئینہ ہو جاتی ہیں لیکن اس آئینہ ہونے کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ خرابیاں بھی بہ یک نظر سامنے آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دبیر کا ایک قطعہ اس طرح شائع ہوا ہے۔

کسی کا کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

بیس صفحات کے بعد ص ۳۱ پر وہی قطعہ بغیر کسی معقول سبب کے ایک دفعہ پھر پیش کیا گیا ہے لیکن تیسرے مصرعے میں "میں" کی جگہ "کہ" درج ہے۔ دبیر جیسے اساتذہ کے کلام میں ہر لفظ کو آیت الٰہی سمجھنے والے اس "میں" اور "کہ" جیسی بھول بھلیاں میں ہمیشہ بھٹکتے رہے اور ہمیشہ بھٹکتے رہیں گے۔ امید کرنا چاہیے کہ پہلے مصرعے میں دبیر نے کندہ ہی نظم کیا ہوگا کیونکہ یہ ان کا ابتدائی کلام ہے لیکن کندہ کی ساقط ہائے ہوز سے قطع نظر کیا کاف کاف کی تین دفعہ متواتر قرأت تنافر حرفی کی کیفیت پیدا نہیں کرتی؟ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے جو کلام ہمارے بزرگوں نے ہمیں پیش خوانی کے لیے دیا تھا اس میں بجائے کندہ کے "نقش" درج تھا۔ کیا یہ کسی گستاخ کا لفظی تصرف تھا یا وہ کلام جس پر دبیر نے خود نظر ثانی کی تھی؟

کلاسکی متون کو پیش کرتے وقت واجبات سے ہے کہ ان کی صحت کا خیال رکھا جائے اور اس طرح کا مطالبہ اگرچہ نامنصفانہ ہے کہ تلاش، تحقیق اور تحریر پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی پروف ریڈنگ پر بھی دیدہ ریزی کریں۔ ان کی پیشکش کا افادی پہلو بہر حال مجروح ہوا ہے کہ افسوس مندرجہ بالا کتابوں میں سے کوئی کتاب اس سہو نظر سے خالی نہیں۔ آف سیٹ کی پلیٹوں پر ہاتھ سے بنی ہوئی تصحیح کے آثار غمازی کرتے ہیں کہ طباعت کا یہ شعبہ توجہ سے محروم نہیں رہا۔ لیکن جب متعارف متون میں اختلاف کی نشان دہی ممکن ہے تو ایسے متون کے بارے میں کوئی کیا کہے جسے چند خوش نصیبوں نے ہی دیکھا ہے۔ مثال کے طور پر ص ۳ پر یہ مشہور مصرع

باقی صفحہ ۶۲ پر

کے جس نے اردو جاننے والے ہزاروں میل کی دوری پر منتشر ہو گیا ہے جہاں کا ماحول الگ، معاشرہ مختلف، تہذیب جدا، تمدن علیحدہ۔ بلکہ یا تو دوسری نسلیں ان کا صرف جسم وہاں رہتا ہوگا اور روح بھی طور پر اسی اردو دنیا یعنی دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، لاہور اور کراچی کی فضاؤں میں اپنے آپ کو رکھے ہوں گے۔ کیونکہ یہ تو بے حد مشکل ترین کام تھا۔

بہر حال مرزا دبیر پر مندرجہ ذیل کتب کی آج ۱۵ مارچ ۲۰۰۵ء کو رسم اجرا حدیث دل ٹرسٹ کی جانب سے انجام دی جا رہی ہے۔

(۱) مصحف فارسی (مجموعہ کلام) تحقیق، تدوین، ترتیب

(۲) مثنویات دبیر

(۳) مجموعہ نظم مرزا دبیر

(۴) طالع مہر مرزا دبیر کا غیر منقوط کلام

(۵) مسلک سلام دبیر

(۶) ابواب المصائب تصنیف مرزا دبیر مع مقدمہ سوانح عمری و تشریح

اور اس کے بعد رباعیات دبیر اور کلیات نظم زیر ترتیب ہیں اور امید ہے وہ بھی جلد ہی منظر عام پر آ سکیں گی۔ ہم بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہیں کہ پروردگار عالم ڈاکٹر تقی عابدی کو نظر بد سے محفوظ رکھے اور رثائی ادب کے لیے ان کا یہ کار مسیحائی اسی طرح معیاری انداز میں جاری رہے کیونکہ اس کی اشد ضرورت ہے۔ یوں تو ہر دور میں ہر قسم کا ادب جتنا تخلیق ہوا ہے سب محفوظ نہیں رہ سکا کچھ ضائع اور تلف بھی ہوتا رہا۔ لیکن جہاں تک رثائی ادب کا سوال ہے یہ سب سے زیادہ ضائع ہوا ہے۔ اور اسے محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔ آج بھی شمالی ہندوستان میں بستی بستی پرانے دیوان خانوں، عاشور خانوں، حویلیوں، کتب خانوں، عزاخانوں، الماریوں، سوز خوانوں اور تحت اللفظ خوانوں کے بستوں میں ایک کثیر سرمایہ غفلت کے گرد و غبار کے نیچے دبا ہوا ہے۔ جسے محفوظ کرنا ہماری ذمہ داری اور فرض ہے۔ اور پھر اس لیے بھی اسے محفوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسکی افادیت ہمارے آج کے معاشرے کے لیے خاص طور سے بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ ہمارے کا سارا ادب اعلیٰ اخلاقیات اور تہذیب کا نمونہ ہے جس کی آج کے سماج کو خاص طور سے ضرورت ہے۔ معاشرے میں اخلاقی اقدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے میں بھی حسینی ادب اور رثائی ادب ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام تصانیف میں اس وقت صرف ابواب المصائب زیر نظر اور زیر غور ہے۔ جو مرزا دبیر کی نظم سے زیادہ نثر کا نمونہ ہے اس کو صرف ڈاکٹر تقی عابدی نے مرتب کیا ہے۔ بلکہ مرزا دبیر کا زندگی نامہ کے عنوان سے ان کی حیات کا خاصا تفصیلی خاکہ بھی پیش کیا ہے اور ایک نہایت جامع مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ ساتھ ہی مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے تاکہ آج کا عام طالب علم بھی فیض یاب ہو سکے۔

کتاب کے انتساب کے لیے جس ذات کا انتخاب کیا گیا ہے اس سلسلے میں بھی ڈاکٹر تقی عابدی کو داد دینی پڑے گی۔ یعنی یہ انتساب "عاشق دبیر امیر کبیر راجہ میو رام افتخار الدولہ کے نام" ہے۔ انتساب کے آگے دو جملے بھی ملاحظہ ہوں جن میں راجہ میو رام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "جو عشق محمد و آل محمد میں ڈوب کر ابھرے تو کشتی اسلام میں نجات ملی، جنھوں نے اپنی دولت سے عالی شان امام باڑہ بنوا کر عزاداری کو رونق

بخشی جہاں رمضان کی شہادت کی شبوں میں دبیر مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ جو آخر کربلائے معلیٰ جا کر مجاور روضۂ حسین ہو گئے اور زندگی مجاورت ضریح اقدس میں گذار کر خاک شفا میں پیوند ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے محمد و آل محمد کا اطمینان پا کر نجات پا گئے۔"

یہاں انتساب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے جو تحقیق کے بعد معلومات فراہم کی ہے وہ بھی اہم ہے اور انھوں نے جس اسلوب میں پیش کیا ہے وہ بھی دلکش ہے۔

کتاب میں مرزا دبیر کا زندگی نامہ صفحہ ۱۳ سے صفحہ ۳۳ تک یعنی ۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں نام، تخلص، تاریخ ولادت، مقام ولادت، والد، دادا، جد، شریک حیات، اولاد، بھائی بہن، تعلیم و تربیت، اساتذہ، مذہب، شغل، شکل و صورت، تصویر، آواز، لباس، غذا، نظام الاوقات، آداب محفل، حافظہ، خط، اخلاق و کردار، رحم و مروت، سخاوت، مہمان نوازی، نمک و خیرات، قناعت، عدالت، صداقت، خودداری، احترام دل جوئی، وعدہ وفائی، شاعری کا آغاز، مشق سخن، پہلا قطعہ، آخری قطعہ، پہلا مرثیہ، آخری مرثیہ، اساتذہ، ضمیر و دبیر میں رنجش، ضمیر و دبیر میں صفائی، شاگردان، پڑھنے کا طریقہ، طریقۂ تصنیف، اصلاح کا طریقہ اور ایجادات وغیرہ وغیرہ کے علاوہ کئی اہم دلچسپ اور معلوماتی حکایات بھی پوری تحقیق کے بعد بیان فرمائی ہیں۔ جس سے قاری کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شعراء کے تذکرے، ثابت لکھنوی کی 'حیات دبیر' اور شاد عظیم آبادی کی 'پیغمبران سخن' آج چونکہ کمیاب ہو چکی ہیں اس لیے ضروری تھا کہ مرزا دبیر کی ایک جامع اور مختصر سوانح تحقیق کے بعد منظر عام پر آئے۔ یہ ذمہ داری بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑے سلیقے سے پوری کی ہے اور صرف ۲۱ صفحات پر تلخیص پیش کر دی ہے۔

یہ مرزا دبیر کا زندگی نامہ صرف زندگی نامہ ہی نہیں بلکہ مختصر سیرت نامہ بھی ہے۔ کیونکہ اس میں پیش کی گئی حکایات سے کردار کے مختلف پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

البتہ صفحہ ۱۸ پر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا کو لکھنوی لکھا ہے، جب کہ نواب حامد علی خاں امروہوی تھے لکھنؤ میں بیرسٹری ضرور کی ہے لیکن آبائی وطن، اور ولادت وغیرہ امروہہ کی تھی۔ جیسا کہ 'حیات حامد' میں دیا ہوا ہے۔ ان بیرسٹر حامد علی خاں کا ذکر بیر نفیس نے بھی کیا ہے اور جوش ملیح آبادی نے بھی 'یادوں کی برات' میں امروہہ کا ساکن لکھا ہے۔

'ابواب المصائب' میں ڈاکٹر تقی عابدی نے اردو مرثیے میں مرزا دبیر کی ۱۲ ایجادات یعنی اضافوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ جن موضوعات کا مرثیے میں مرزا دبیر کو موجد قرار دیا ہے ان میں سے چند موضوعات کے ابتدائی عناصر اور نقوش کی جھلک قبل دبیر بھی مل جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مرزا دبیر نے ان موضوعات کو مرثیے میں باقاعدہ اور باضابطہ طور پر شامل کیا اور وسعت دی۔ ان ۱۲ ایجادات کے علاوہ مرزا دبیر کی ایک ایجاد اور بھی ہے یعنی وہ پہلے مرثیہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے ایک مرثیے کو عنوان بھی دیا۔ ورنہ عنوانات سے مرثیہ کہنے کا باقاعدہ سلسلہ مرزا دبیر کی وفات کے بھی تقریباً ۵۰ سال بعد شروع ہوا ہے۔ مثلاً نجم امروہوی کا 'سلام حریت'، 'جوش ملیح آبادی' کا 'حسین اور انقلاب' وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس زندگی نامے میں مرزا دبیر کی صرف زندگی ہی بیان کی ہے اس میں اختتام زندگی کا ذکر نہیں ہے اور موت کے بارے میں کچھ تحریر نہیں فرمایا۔ ایک صفحے پر مرزا دبیر کی اردو اور فارسی تصانیف نظم ونثر بھی شامل ہیں۔ جہاں تک کتب پر مقدمے کا سوال ہے یہ بھی ایک خاص انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اور پہلے ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن میں ''ابواب المصائب'' کا ذکر ہونا چاہیے تھا لیکن مصنفین کی غفلت یا عدم توجہی کے سبب قطعاً ذکر نہیں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مرزا دبیر کی پہلی سوانح جو فارسی میں ہے یعنی ''شمس الضحیٰ'' کتاب کا ذکر ہے ان کا ذکر بھی مقدمہ میں حوالے کے ساتھ کردیا ہے۔ یعنی ''حیات دبیر'' افضل حسین ثابت، ''شاعرِ اعظم مرزا سلامت علی دبیر اور باقیاتِ دبیر'' ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری ''مرزا سلامت علی دبیر'' ڈاکٹر محمد زماں آزردہ اور 'پیام عمل' کے مرزا دبیر نمبر میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا مضمون ''اردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ'' وغیرہ وغیرہ میں جو ''ابواب المصائب'' کا ذکر ہے اُسے بھی شامل کرلیا ہے۔

''ابواب المصائب'' کا موضوع مجالس عزا ہیں جن میں سورۂ یوسف سے واقعات کربلا کو ربط دیکر بیان کیا گیا ہے۔ اس خالص رثائی موضوع پر اسی انداز سے اس سے قبل کی فارسی میں ملا واعظ حسین کاشفی کی ''روضۃ الشہدا'' اور اس کے بعد ''کربل کتھا'' ان دونوں تصانیف سے موضوع کے اعتبار سے تقابل اور موازنہ بھی کیا ہے اور تینوں تصانیف کا جائزہ لیکر نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس میں زبان و بیان مسجع ومقفیٰ عبارت، صنعتوں کے استعمال، جمع الجمع کا استعمال، صرف ونحو کے اصولوں کی پابندی یا عدم پابندی اور مصنفین کے جذبۂ فخر ومباہات اور عجز وانکسار کے بیان کا بھی تقابل کیا ہے۔

دوسری طرف اسلوب کے اعتبار سے 'ابواب المصائب' کی نثر کا 'فسانہ عجائب' کی نثر سے بھی موازنہ کیا ہے اور مرزا دبیر کی نثر نگاری کی خصوصیات، خوبیاں، سادگی اور صفائی کا بیان کر کے نثر نگاری میں ان کی اہمیت اور مقام کو ظاہر کیا ہے۔ ساتھ ہی قدیم اردو نثر نگاری کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ یہ اسلوبیاتی تجزیہ ڈاکٹر تقی عابدی کی عمق النظری کا ثبوت ہے۔ انھوں نے 'ابواب المصائب' کو اردو کے نثری ارتقا کا ایک سنگ میل ثابت کیا ہے اور گراں بہا تصنیف بتایا ہے۔ اور اسے صرف اس لیے نظر انداز کرنا کہ اس نثر پارے کا موضوع رثائی ہے یہ ادب میں بے ادبی ہے۔

مقدمے کے علاوہ ایک باب 'واقعاتی مناظرہ' عنوان سے بھی ہے۔ اس میں بھی دیدہ وری اور دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ 'ابواب المصائب' 'روضۃ الشہدا' اور 'کربل کتھا' سے علیحدہ اور تخلیقی تصنیف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے رثائی ادب کی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا ہے جو رثائی ادب کے دبے، چھپے اور گمشدہ خزینے کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، رثائی ادب کے سلسلے میں جو باقاعدہ ایک تحریک چلائی ہے، جو غیر معروف یا گمنام مرثیہ نگار شعرأ کے متعارف کرانے کی پیہم کاوش ہے اور جو رثائی ادب منظر عام پر آچکا ہے اس کا نئے اور تکنیکی زاویوں سے تنقیدی جائزہ لینے کی ٹھانی ہے وہ یقیناً نہ صرف رثائی ادب بلکہ اردو زبان و ادب پر بھی ایک احسان عظیم ہے اس لیے آج ڈاکٹر تقی عابدی اور رثائی ادب لازم وملزوم ہو چکے ہیں۔ اور یقیناً وہ عصر حاضر میں رثائی ادب کے ایک مسیحا ہیں۔

☆☆☆

مثنویاتِ دبیرؔ (کلام دبیرؔ جلد ۴)

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ممبئی

دہلی میں پیدا ہونے والے اور کنیڈا میں مقیم، ہندوستانی نژاد ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی، ڈگریوں کی تعداد کے اعتبار سے بھلے ہی ایک شان دار طبیب ہوں لیکن کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک ایماندار ادیب ہیں، جن کا ذوق وشوق تحقیق وتنقید ہے اور مزاج اور افتادِ طبع عرفانی اور روحانی۔ اس کا اظہار ان کی اُن تصانیف سے ہوتا ہے جن میں مذہبی عقائد واعترافات کے ساتھ ساتھ روحانی اور عرفانی ادب کا ذائقہ بھی شامل ہے۔ مثلاً جوشِ مودت، سلکِ سلامِ دبیر، تجزیۂ یادگارِ انیس، اقبال کے عرفانی زاویے، تجزیہ شکوہ جوابِ شکوہ اور رباعیات دبیر وغیرہ وغیرہ۔ اس جاں بکف محقق نے مختلف سمتوں میں دشت نوردی کی ہے۔ جن میں سلام، مرثیہ، رباعی وغیرہ کے علاوہ چند نثری اصناف بھی شامل ہیں۔ اور اب ان کا یہ شوق کلامِ دبیر سے متعلق اس سلسلۂ مطبوعات سے مترشح ہے جس کی چھ جلدیں حال ہی میں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب 'مثنویاتِ دبیر' اسی سلسلے کی چوتھی جلد کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں قاری کی تفہیم اور موضوع کی مناسبت سے ایک باب ''مثنوی۔ ایک اہم صنفِ سخن'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں صنفِ مثنوی کی فنی ومعنوی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اس کی ہئیت، اوزان وبحور، معنوی ساخت، محاسن ولوازم اور معیارِ نقد پر مختلف نقادوں کی آرا کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک مثنوی کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ اردو کی تمام اصنافِ سخن میں اپنی انفرادی خصوصیات کے باعث ممتاز مقام رکھتی ہے۔ شبلی کے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''انواعِ شاعری میں یہ صنف تمام انواعِ شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔'' شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کی ابتدائی نظمیں بھی مثنویوں کی شکل میں ملتی ہیں۔ مثلاً خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور شاہ برہان الدین جانم کے چکی نامے، ولی ویلوری کی روضۃ الشہدا اور قطبن کی مرگاوتی وغیرہ لیکن تعجب یہ ہے کہ جتنی طبع زاد، غیر طبع زاد یا ماخوذ اور ترجمہ شدہ مثنویاں اردو میں لکھی گئیں، اتنی تنقیدی کتابیں اس صنف پر نہیں ملتیں۔ پھر بھی اطمینانِ قلب کے لیے یہ امر کافی ہے کہ جو کام مثنویوں پر ابتدا سے آج تک ہوا ہے وہ اپنی اپنی جگہ لائقِ توجہ اور قابلِ قدر ہے۔ مثلاً اردو مثنوی کا ارتقاء (عبدالقادر سروری)، تاریخِ مثنویاتِ اردو (جلال الدین احمد جعفری) اردو مثنویات (امیر احمد علوی) اردو مثنوی شمالی ہند میں (ڈاکٹر گیان چند جین) اردو مثنوی۔ ایک عمومی مطالعہ (اظہر علی فاروقی)، اردو مثنوی کا ارتقا۔ شمالی ہند میں (سید محمد عقیل)، اردو کی دو قدیم مثنویاں (نائب حسین نقوی)، اردو کی تین مثنویاں (خان رشید)، اردو کی منظوم داستانیں (فرمان فتح پوری)، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) اور شمالی ہند کی تاریخی مثنویاں (ڈاکٹر کندن لال کندنؔ) وغیرہ۔ ان میں سے بیش تر کے حوالے ڈاکٹر تقی عابدی کے ہاں موجود ہیں لیکن ایک اہم نام علی جواد زیدی کا ہے جن کی کتاب 'مثنوی نگاری' (مطبوعات سلسلہ اتر پردیش نمبر ۲) جس میں اتر پردیش کی مثنویوں پر تحقیقی کام ملتا ہے اور جس میں صنفِ مثنوی سے متعلق ایک بسیط اور وقیع مقدمہ شامل ہے، غالباً ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر سے نہیں گذر سکی یا انھیں دستیاب نہیں ہو سکی، ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ کیوں کہ موضوع سے متعلق براہِ راست تنقیدی کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر عابدی نے ان تنقیدی کاوشات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے جن میں ضمناً مثنوی کے فن پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً امداد امام اثر کی

ہر چند کہ مثنوی کی اصطلاح عربی سے لی گئی اور یہ مزدوج یعنی دو دو ہم قافیہ مصرعوں کے جوڑی دار اشعار پر مشتمل ہوتی ہے جس کی خوبی تسلسل بیان اور ترتیب واقعات ہے لیکن اس کا فروغ ایران میں ہوا اور اردو پر اس کے دہرے اثرات ملتے ہیں۔ فارسی مثنویوں کی مروجہ سات بحروں کے جن پر ڈاکٹر تقی عابدی نے بحث کی ہے اور سنسکرت کی طویل رزمیہ نظموں کے جو ''دوہا کوش'' کی روایت سے وابستہ رہیں، اردو والوں نے ان میں اضافہ کر کے مثنوی کی بحروں کی تعداد گیارہ تک پہنچا دی۔ بعض نقادوں نے تو موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کے لیے بحریں بھی مخصوص کر دیں۔ تقی عابدی نے ان مروجہ سات بحروں کے ارکان بھی تحریر کیے ہیں جو اردو مثنویوں میں عام طور پر مستعمل ہیں۔

بہر حال اردو میں مثنویاتی ادب وافر مقدار میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ یہ طے کرنا بھی مشکل ہے کہ اردو کی اولین مثنوی کون سی ہے۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ تحقیقی سفر بھی آگے بڑھتا جا رہا ہے اس لیے اس ضمن میں نقادوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل حضرت بابا فرید شکر گنج کے ان صوفیانہ اشعار میں اردو مثنوی کا پہلا نقش دیکھتے ہیں جو ۳۷۱ھ کی تحریر ہے۔ جس کے دو شعر یہ ہیں۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پاک ۔۔۔ پیش رو اصفیا کے ہوتے خوک
خاک لانے سے گر خدا پائیں ۔۔۔ گائیں بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (اور ڈاکٹر جمیل جالبی) کے مطابق اردو کی اولین مثنوی بہمنی دور کے شاعر نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ'' (۸۶۷ھ۔۸۶۵ھ) ہے۔ جب کہ علی جواد زیدی ''مثنوی نگاری'' میں ملا داؤد کی مثنوی ''چنداین'' (۷۸۱ھ مطابق ۸۰-۱۳۷۹ء) کی نشان دہی کرتے ہیں جو لورک اور چندا کے قصے پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے سید محمد عقیل کے حوالے سے بابا فرید شکر گنج کی مثنوی ہی کو اولین مثنوی قرار دیا ہے۔ نیز اٹھارہویں صدی کے اواخر اور خصوصی طور پر بیسویں صدی میں مثنوی نگاروں نے ہیئت کی جو تبدیلی کی جس کی وجہ سے مثنوی اور نظم کا فرق جاتا رہا، ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی ڈاکٹر گیان چند جین اور سید محمد عقیل کی طرح اس دور کی نظموں کو مثنوی کی بحث سے خارج کر دیا ہے۔

چونکہ مثنوی میں موضوع اور اشعار کی قید نہیں، لہذا اس میں ایک تنوع ملتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی دیگر نقادوں کی طرح موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کی مختلف قسموں کو گناتے ہوئے مذہبی مثنویوں کا ذکر کیا ہے اور مثنویات دبیر کو مذہبی مثنویوں کے زمرے ہی میں رکھا ہے۔

مصنف مثنوی سے قطع نظر ایک پورے باب میں انھوں نے اس بات پر اظہار تاسف کیا ہے کہ ہمارے اکثر ناقدین اور محققین نے سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے مثنویات دبیر کو طاق نسیاں کے سپرد کر دیا۔ سب سے زیادہ شکوہ انھیں مولانا امداد امام اثر کی ''بے خبری'' سے ہے جنھوں نے دبیر کی مثنوی نگاری سے انکار فرمایا ہے۔ اس سے زیادہ دکھ انھیں اس بات کا ہے کہ خود دبستان دبیر کے شعرا نے بھی اس طرف سے غفلت برتی، یہاں تک کہ چودھری سید نظیر الحسن فوق کی ''المیزان'' ''مرزا دبیر کی شاعری پر'' مفصل بحث کے باوجود دبیر کی مثنویات کے ذکر سے خالی ہے۔ اوج لکھنوی کے شاگرد سید فراز حسین خبیر لکھنوی، جنھوں نے مرزا دبیر کے چودہ عدیم النظیر مرثیوں کو ''سبع مثانی'' کے عنوان سے مرتب کیا، اس میں بھی مثنویات دبیر کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اگر بعض حضرات نے ذکر کیا بھی ہے تو سرسری اس جہان سے گزر گئے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی کے مطابق ان طرز میں

میں مرزا دبیر کی پہلی سوانح حیات ''شمس الضحیٰ'' کے مصنف مولوی افضل علی بھی شامل ہیں۔ جن خوش نصیب محققوں نے دبیر کی طرف سے دو مثنویوں احسن القصص اور معراج نامہ کا تذکرہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر سید سلیمان حسین (مثنویات دبستان لکھنو) اور ڈاکٹر سید محمد عقیل ہیں جنھوں نے اپنی کتاب کے ضمیمہ نمبر ۳ میں دبیر کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی ایک ایک دو دو سطروں میں۔ ''حیات دبیر'' کے مصنف ثابت حسین کو ڈاکٹر تقی عابدی اس لیے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ دبیر سے واقفیت کے باوجود ان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ انھیں یہ بھی پتا نہیں کہ ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' دو الگ الگ مثنویاں ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے انھیں گلہ ہے کہ انھوں نے میر انیس کی مثنویات کے بارے میں تو کچھ ... سے زیادہ صفحات میں تبصرہ کیا ہے اور ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کو صرف ایک صفحے کے تبصرے کے قابل گردانا۔ جب کہ ان مثنویوں پر ڈیڑھ سو صفحات لکھے جا سکتے تھے۔ ڈاکٹر کندن لال کندن سے وہ اس لیے شکوہ کناں ہیں کہ انھوں نے ''ہندوستانی تاریخی مثنویاں'' میں سو کے قریب تاریخی مثنویوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے لیکن مرزا دبیر کی مثنویات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ راقم کا خیال ہے کہ اس ضمن میں ڈاکٹر تقی عابدی کو ڈاکٹر کندن لال کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی طرح جن کے نام یہ کتاب منسوب کی گئی ہے، مستثنیٰ قرار دینا چاہیے کیوں کہ دونوں کا موضوع اس کی اجازت نہیں دیتا تھا جس طرح ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا موضوع ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' ہیں جن میں مقامی موضوعات کی بنیاد پر مثنویوں کو جن چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ان میں پہلی قسم ان مذہبی مثنویوں کی ہے جو ہندوستانی قصوں سے ماخوذ ہیں لہذا مثنویات دبیر اس میں شامل نہیں کی جا سکتی تھیں کہ وہ ہندوستانی قصوں کی نہیں، اسلامی اور خصوصاً شیعی عقائد کی تشریح کرتی ہیں اسی طرح ڈاکٹر کندن لال کندن کا موضوع تاریخی مثنویاں ہیں جب کہ تقی عابدی خود اس کا اقرار کرتے ہیں کہ مثنویات دبیر کا شمار مذہبی مثنویوں میں ہونا چاہیے کیوں کہیں کہیں صفحہ تاریخ ضرور قلم بند ہوگئی ہے۔ البتہ وہ غیر مطبوعہ مثنوی جس کا موضوع سراسر تاریخی ہے۔ ہنوز تحقیق کی منزلوں میں ہے۔ غالباً اسی لیے اس کا ذکر نہ ڈاکٹر نارنگ کے ہاں ملتا ہے اور نہ ڈاکٹر کندن کے۔ البتہ ڈاکٹر تقی ان محققین اور ناقدین کے گلہ گزار ہونے میں حق بجانب ہیں جنھوں نے دبیر کی مثنویوں کا ذکر تو کیا مگر وہ بھی سرسری۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے بھی جن کا شمار ماہر دبیریات میں کیا جا سکتا ہے، دبیر کی جس مثنوی کا انکشاف 'ممتاز نامہ' کے عنوان سے کیا ہے، وہ بھی دراصل 'معراج نامہ' ہی کا دوسرا نام ہے جو عہد نصیر الدین حیدر شاہ میں ان کی ملکہ ممتاز الدولہ کی فرمائش پر لکھی گئی اور اسی رعایت سے ان کے نام سے منسوب ہو کر ممتاز نامہ نام پایا۔ اسی طرح ڈاکٹر کاظم علی خان دبیر کی تیسری مثنوی کا جو دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں شامل ہے، ذکر تو کرتے ہیں مگر اس کے متعلق خاطر خواہ مواد یا معلومات نہیں دے پائے ہیں۔ ڈاکٹر تقی نے اپنی تحقیق سے بات ثابت کی ہے کہ اس مثنوی کا پورا نام ''اسناد سورۂ الحمد وفضائل چہاردہ معصوم علیہم السلام'' ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر زماں آزردہ کی دریافت شدہ غیر مطبوعہ مثنوی کے علاوہ ڈاکٹر تقی نے دفتر ماتم کی بیسویں جلد سے دبیر کی مزید چار مثنویاں دریافت کی ہیں۔ ماحصل تحقیق کی ان کاوشوں کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ دبیر نے محض دو مثنویاں نہیں بلکہ کل آٹھ مثنویاں لکھیں۔ تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ احسن القصص، ۲۔ معراج نامہ یا ممتاز نامہ، ۳۔ اسناد سورۂ الحمد وفضائل چہاردہ معصوم علیہم السلام دریافت کاظم علی خاں، ۴۔ ولا...

و وفات حضرات چہاردہ معصوم علیہم السلام، ۵۔ غیر مطبوعہ مثنوی، ۶۔ مثنوی شہادت امیر المومنین دریافت پروفیسر آزردہ، ۷۔ مثنوی در شہادت حضرت علی اکبرؑ، ۸۔ مثنوی عزائے حیدر کرار بر غرہ ماہ شوال کہ روز عید است۔

ان مثنویات کے موضوعات کی تفصیل یوں ہے۔ احسن القصص ایک طولانی مثنوی ہے جس میں تین ہزار تین سو سولہ اشعار ہیں اور اس میں چہاردہ معصومین کی ولادت کے حالات اور معجزات قصوں میں نظم کیے گئے ہیں۔ معراج نامہ چھ سو چورای اشعار پر مشتمل ہے اس میں معراج نبوی اور ائمہ اثنا عشر کے فضایل رقم کیے گئے ہیں۔ دبیرؔ کے علاوہ اس موضوع پر دیگر شعرا نے بھی مثنویاں کہیں مثلاً مظفر علی اسیر کی معراج الفضائل، محتشم شکوہ آبادی کی ''معراج المضامین'' اور میر ضمیر کی ''ریحان معراج'' وغیرہ ان میں رسولؐ و ائمہ اثنا عشر کے فضائل، مناقب اور معجزات نظم کیے گئے ہیں۔ دبیرؔ کا 'معراج نامہ' شعری اور فنی اعتبار سے قابل قدر کارنامہ ہے۔ بے عنوان مطبوعہ مثنوی سماجی حالات پر ہے اس میں پانچ سو اٹھارہ اشعار ہیں۔ مثنوی شہادت علی اکبر میں اکسٹھ اشعار ہیں۔ البتہ نو دریافت مثنویاں مثلاً مثنوی شہادت امیر المومنین (چودہ اشعار) اور مثنوی عزائے حیدر کرار بر غرہ ماہ شوال کہ روز عید است' (سولہ اشعار) مثنویوں سے زیادہ صنف ماتم کے قریب ہیں ان میں ہیئیہ رنگ پایا جاتا ہے اور عام طور پر دبیرؔ کی یہ مثنویاں ماتم کے طور پر ہی مجالس عزا میں ماتمی لے میں پڑھی جاتی ہیں۔ خصوصاً اول الذکر جس کا یہ شعر ٹیپ کے مصرعے کی طرح ماتم کے دوران بار بار دہرایا جاتا ہے۔

یہ رات مرتضٰیؑ کی شہادت کی رات ہے   زہراؑ کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات ہے

اسی طرح مثنوی عزائے حیدر کرار بھی عید کے موقع پر حضرت علیؑ کے دسویں کی یاد میں ماتم کا انداز لیے ہوئے ہے۔ اور مادر عباس جناب ام البنین کی جانب سے فریادی ماتم کی شکل ہے۔ ملاحظہ ہو

نام بیوہ اب ہمارا ہوگیا   آج دسواں بھی تمہارا ہوگیا

مثنوی تاریخ ولادت وفات حضرات چہاردہ معصومؑ کی ادبی اہمیت سے قطع نظر یہ مثنوی محض اس غرض سے کہی گئی معلوم ہوتی ہے کہ لوگ اس بہانے سے چودہ معصومین کی ولادت کی تاریخیں حفظ کرلیں۔ لہٰذا اس مثنوی کو مذہبی سے زیادہ تدریسی یا فرہنگی مثنوی کہا جاسکتا ہے۔ بقول علی جواد زیدی شاعروں نے یہ مثنویاں صرف اس لیے لکھیں کہ پڑھنے والوں کو منظوم ہونے کی وجہ سے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ ایسی مثنویوں کی تعداد خاصی ہے جن میں عقیدہ، فقہ وغیرہ سے متعلق معلومات کو بحر و قافیہ کے سانچوں میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مثنوی کے ضمن میں خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ ممکن ہے اسی سبب سے بعض محققین نے انھیں قابل اعتنا نہ گردانا ہو۔ بہر حال ہر مثنوی کی ابتدا میں اس کا تنقیدی جائزہ اور تاریخی و تحقیقی حال قلم بند کیا گیا ہے۔ نیز مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ذیلی حاشیوں میں درج ہے۔ اس دریافت سے ایک نیا دبیرؔ ہمارے سامنے آتا ہے جو ایک اعلیٰ مقام مرثیہ گو ہی نہیں، ایک قادر الکلام مثنوی نگار بھی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ 'دبیریات' کے ادب میں یہ تحقیقی کاوش ڈاکٹر تقی عابدی کا بلاشبہ ایک کارنامہ ہے اور دبیرؔ سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

☆☆☆